درس ۷

نورِ ایمان کے اجزائے ترکیبی

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سُورۃ النّور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝

اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ ، مَثَلُ نُورِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ، الْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ، الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لاَّ شَرْقِيَّةٍ وَّلاَ غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، نُورٌ عَلٰى نُوْرٍ، يَهْدِى اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَآءُ، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الأَمْثَالَ لِلنَّاسِ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۝ فِيْ بُيُوْتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالآصَالِ ۝ رِجَالٌ لاَّ تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلاَ بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ، يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوبُ وَالأَبْصَارُ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ، وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً، حَتّٰى إِذَا جَآءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهُ فَوَفّٰهُ

حِسَابَهُ، وَا للهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ o أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ، ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ، إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا، وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ ا للهُ لَهُ نُوْرًا فَمَالَهُ مِنْ نُّوْرٍo

صَدَقَ ا للهُ الْعَظِيمُ! رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي o وَيَسِّرْلِي أَمْرِيo وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي o يَفْقَهُوا قَوْلِي o

آج ہم قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے ساتویں درس کا آغاز کر رہے ہیں جو مباحثِ ایمان کے ضمن میں تیسرا سبق ہے اور سورۃ النور کے پانچویں رکوع پر مشتمل ہے۔

سابقہ درس میں اولوا الالباب یا صدیقین کے شعوری اور اکتسابی ایمان کی وضاحت ایمان عقلی اور ایمان سمعی کے تدریجی مراحل کے حوالے سے ہوئی تھی۔ سورۃ النور کی مشہور "آیتِ نور" (آیت نمبر ۳۵) میں اس ایمان کو ایک نور قرار دے کر اس کی اصل حقیقت کو اس کے دو اجزائے ترکیبی یعنی "نورِ فطرت" اور "نورِ وحی" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس آیہ مبارکہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"اللہ ہی آسمان و زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو' چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمکدار ستارے کی مانند روشن ہو۔ وہ چراغ جلتا ہے ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو' خواہ اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ روشنی ہے روشنی پر۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے ــــــ اور اللہ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ (یعنی وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہے!)"

یہ آیۂ مبارکہ پورے قرآن مجید میں بھی ایک منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ بالخصوص سورۃ النور میں تو اس کی حیثیت بالکل ایسے ہے جیسے ایک نہایت قیمتی اور خوبصورت انگوٹھی ہو'

جس کے درمیان میں نہایت قیمتی نگینہ جڑا ہوا ہو۔ اس لئے کہ یہ سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورۃ النور کل نو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ گویا پانچواں رکوع اس کے عین وسط میں واقع ہے' چار رکوع اس سے قبل ہیں اور چار اس کے بعد۔ اس رکوع میں ایمان اور اس کی اصل حقیقت کو تمثیلات کے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں "ایمان کی حقیقت" اور اس کی "ماہیت" کے لئے تمثیل لائی گئی ہے کہ وہ ایک نور ہے' ایک روشنی ہے جس سے انسان کا قلب' اس کا سینہ اور نتیجتاً اس کا پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اس نور کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک وہ نور فطرت جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے اور دوسرا نور وحی جس سے نور فطرت کی تکمیل ہوتی ہے۔

تمثیل یا تشبیہ کا استعمال کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں تمثیلوں اور تشبیہوں کو اس قدر کثرت سے کیوں استعمال فرمایا گیا یہ بات ہمیں جان لینی چاہئے کہ یہ معاملہ صرف قرآن مجید ہی کا نہیں ہے بلکہ یہ تمام آسمانی کتابوں کا مشترک وصف ہے۔ خصوصاً انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے بیان ہوئی ہیں' جو نہایت اعلیٰ اور حد درجہ معنی خیز ہیں اور دنیا کی اکثر زبانوں کے کلاسیکل ادب میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ آسمانی ادب میں ان تمثیلوں کے بکثرت استعمال کا سبب یہ ہے کہ بعض مضامین اتنے لطیف ہوتے ہیں اور فہم و ادراک کی عمومی سطح سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اولاً تو ان کو صراحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ثانیاً' اگر انہیں عام انداز میں بیان کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہو جائے اور عوام الناس کسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں۔ دوسری طرف ان لطیف اور ماورائی حقائق کا ایک اجمالی تصور انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے۔ لہٰذا آسمانی کتابوں میں ایسے حقائق کے ضمن میں تمثیل یا تشبیہ کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ اس سے ہر شخص اپنے فہم و شعور کی سطح کے مطابق استفادہ کرے۔ چنانچہ انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک حواری نے سوال

کیا کہ "استاد! آپ تمثیلوں میں گفتگو کیوں کرتے ہیں؟" حضرت مسیحؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "تاکہ وہی سمجھیں جن کا سمجھنا مفید ہے"۔ حاصلِ کلام یہ کہ تمثیل کی احتیاج انسان کو ہے اللہ کو نہیں۔ جیسے زیرِ مطالعہ آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا گیا:
﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ یعنی "اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اور اللہ کو تو تمام چیزوں کا علم ہے"۔ اور یہ علم "کَمَا حَقُّهٗ" بھی ہے اور "کَمَا هِیَ" بھی۔ ہر شے کی اصل حقیقت اس پر روشن ہے۔ پس تمثیل کی احتیاج معاذ اللہ ثم معاذ اللہ' اللہ کو نہیں بلکہ اس کی ضرورت اصلاً ہمیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال بھی آپ کے سامنے آجائے تو مناسب ہوگا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانونِ اسلامی کی بنیاد صرف قرآن مجید پر نہیں ہے بلکہ سنّتِ رسول ﷺ بھی اس کی دوسری لازمی بنیاد ہے تو بعض لوگ ناسمجھی کے باعث یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید کو سنت کی ضرورت ہے گویا قرآن سنت کا محتاج ہے! معاذ اللہ' اصل بات یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل و معاملات میں عملی رہنمائی کے حصول کے لئے سنّتِ رسول ﷺ کے محتاج ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾
(النحل : ۴۴)

"(اے نبیؐ!) اور ہم نے آپؐ کی جانب یہ ذکر یعنی قرآن مجید نازل فرمایا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے لئے واضح کریں جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے"۔

اس آیت مبارکہ کی رو سے قرآن کی تبیین' اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کا واضح اور روشن اسوہ اور نمونہ پیش کرنا' یہ تمام امور حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات و ارشادات نیز آپؐ کے عمل اور آپؐ کی سنت کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ بالکل یہی بات یہاں ہے کہ تمثیلوں کی احتیاج اللہ کو نہیں ہے بلکہ انسان کو ہے۔ اللہ تو ہر شے سے واقف ہے' ہر شے کا علم رکھتا ہے: ﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

لِلنَّاسِ ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ "اور اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے' اور اللہ تو ہر شے کا علم رکھتا ہے"۔

کیا اللہ کی ذات' نور سے عبارت ہے؟

اب اس تمثیل پر غور کیجئے جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "آسمانوں اور زمین کی روشنی اللہ ہی ہے"۔

ظاہر الفاظ سے یہاں ایک مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید یہاں "نور" کا اطلاق باری تعالیٰ کی ذات پر ہو رہا ہے۔ اس مغالطے سے بچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہئے کہ 'بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ' وہ وراءالوراء' ثم وراءالوراء' ثم وراءالوراء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم ہمارے فہم و شعور' احساس و ادراک' فکر و نظر حتیٰ کہ تصور و تخیل' کی سرحدوں سے بہت دور اور پرے ہے۔ بقولِ غالب ؏

"ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود!"

یا بقول شخصے ؏

"اے بروں از وہم و قیل و قالِ من!"

یا بقول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ : "اَلْعِجزُ عَن دركِ الذاتِ اِدراكٌ" یعنی اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا قرار و اعتراف ہی اصل ادراک ہے۔ گویا "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!" یعنی جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ میں اللہ کی ذات کو نہیں جان سکتا تو یہی کمال عرفان ہے۔ یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ : "وَالبحثُ عَن كُنهِ الذاتِ اِشراكٌ" یعنی اللہ کی ذات کے بارے میں بحث اور کھود کرید سے انسان شرک اور فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا ____ الغرض اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ آیتِ زیرِ درس میں وارد شدہ تمثیل اللہ کی ذات کے لئے نہیں بلکہ اس پر ایمان کی حقیقت کے بیان کے لئے ہے' گویا نور کے لفظ کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نہیں' ایمان باللہ پر ہے۔

اس ضمن میں امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ نور لامحالہ کوئی مادی شے ہے یا کوئی عارضی کیفیت' اور ان دونوں کی نسبت باری تعالیٰ پر نہیں ہے' جیساکہ عہدِ حاضر کے بعض مفسرین و مترجمین قرآن نے گمان کیا ہے۔ اس کی ایک قطعی اور حتمی دلیل اس آیت مبارکہ کے الفاظ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس میں دو مرتبہ "نُورِہٖ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مرکب اضافی ہے۔ جب کسی شے کی اضافت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو وہ شے اس کا غیر ہوتی ہے۔ جیسے میں کہوں "میرا قلم" تو اس میں "قلم" علیحدہ ہے اور "میں" علیحدہ ہوں' اور نسبت اضافی میرے اور قلم کے مابین ہے۔ تو "نُورِہٖ" کے معنی ہیں "اس کا (یعنی اللہ کا) نور" ____ لہٰذا نور کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر درست نہیں ہے۔ اس کی ایک دوسری دلیل قطعی سورۃ الانعام کی پہلی آیت مبارکہ میں موجود ہے' جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نور سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہو سکتی۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾

"تمام شکر و سپاس' تمام ثناء و تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین' اور بنائے اندھیرے اور روشنی"

ثابت ہو گیا کہ نور "مجعول" یعنی بنائی ہوئی شے ہے اور ظاہر بات ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کو مجعول نہیں کہا جا سکتا۔

اب نور کو سمجھئے! ہم جس نور سے واقف ہیں وہ "نورِ خارجی" ہے' خارجی روشنی۔ یہ نور یا روشنی اصل میں اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم سب ایک ایسے کمرے میں موجود ہیں جہاں برقی قمقموں کی روشنی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ کمرہ خوب روشن ہے اور جگمگا رہا ہے۔ اس صورت میں اسی روشنی کے ذریعے ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں' لیکن کسی سبب سے فیوز اڑ جائے اور روشنی چلی جائے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکیں گے درآنحالیکہ ہم سب کی آنکھوں میں دیکھنے کی صلاحیت موجود رہے گی۔ گویا اشیاء کا ظہور بواسطہ نور ہو رہا ہے۔ یہ ہے ہماری بصارت ظاہری جس کا ذریعہ بنتا ہے ایک مادی اور خارجی نور۔ اسی طرح ایک نور باطنی ہے جس سے حقائقِ اشیاء ظاہر ہوتے

ہیں' جیسے نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا منقول ہوئی ہے کہ : ((اَللّٰھُمَّ اَرِنی حقیقۃَ الاشیاءِ کَماھِیَ)) "اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں"۔ شاید اسی سے شاعر نے خیال مستعار لے کر کہا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

تو وہ جو ایک بصیرتِ باطنی ہے' اسے ایک نورِ باطنی کی ضرورت ہے اور وہ نورِ باطنی ہے نورِ معرفتِ خداوندی۔ اسی نورِ معرفتِ خداوندی کا ذکر سورۃ البقرہ میں آیت الکرسی کے بعد دوسری آیت میں ہے :

﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾
"اللہ اہل ایمان کا دوست ہے' ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف"

گویا اللہ کو پہچان لیا تو اس کائنات کے جملہ حقائق کونیہ روشن ہو جائیں گے اور حقائقِ تکوینی کے ساتھ ساتھ حقائقِ تشریعی بھی اپنے جملہ اسرار و حکم کے ساتھ منور ہو جائیں گے اور ہر شے کی حقیقت نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ یہ جملہ حقائق منکشف ہو جائیں گے کہ آغاز کیا ہے؟ اختتام کیا ہے؟ وجود کی ماہیت کیا ہے؟ موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر کی حقیقت کیا ہے؟ شر کی حقیقت کیا ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ مجازات و مکافات کیوں ضروری ہیں؟ یہ ساری چیزیں انسان کو معلوم ہو جائیں گی اگر وہ اللہ کو جان لے اور اس کو پہچان لے۔ جس طرح ہماری بصارتِ ظاہری کے لئے نورِ خارجی ضروری ہے' اسی طرح بصیرتِ باطنی کے لئے نورِ معنوی ضروری ہے' جو عبارت ہے معرفتِ خداوندی یا ایمان باللہ سے۔

پہلی تمثیل۔ "مَثَلُ نُوْرِہٖ" کا مفہوم!

اب آگے چلئے' ارشاد فرمایا : ﴿مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ﴾ "اس کی روشنی کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو" ـــــــ یہاں جو "نُوْرِہٖ" (اس کی روشنی) کے الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ متکلمین کی اکثریت نے اسے نورِ ہدایت قرار دیا ہے کہ یہ تمثیل نورِ ہدایت کے لئے ہے۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآن ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قرآن کو "نُور" سے تعبیر کیا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ یہاں نور سے مراد ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اس لئے کہ آپؐ کے بارے میں سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۴۶ میں واضح طور پر فرمایا گیا کہ آپؐ ایک روشن چراغ ہیں۔ ویسے ہم تینوں کو جمع کرلیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ ہدایت' قرآن اور رسول مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں' جیسے سورۃ البیّنہ میں ارشاد فرمایا :

﴿ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ ﴾

"یہ سارے اہل کتاب اور یہ سارے مشرکین (اپنے کفر اور شرک سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس "بیّنہ" نہ آجاتی۔"

آگے فرمایا کہ وہ "البیّنہ" کیا ہے؟

﴿ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ ﴾

"ایک رسولؐ' اللہ کی طرف سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوئی ہیں"۔

گویا رسولِ خدا اور صحیفۂ خداوندی مل کر ایک وحدت بنتے ہیں اور اس طرح "بیّنہ" وجود میں آتی ہے' اور یہ ہے اللہ کی روشن دلیل' اللہ کی حجت' اللہ کی برہان۔

"مَثَلُ نُوْرِهٖ" کے ضمن میں دو صحابہؓ کی رائے بھی نہایت قابل غور ہے۔ یہ دونوں صحابہؓ وہ ہیں جن کی قرآن فہمی کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے ہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہاں "مَثَلُ نُوْرِهٖ" سے مراد ہے "مَثَلُ نُوْرِ مَنْ آمَنَ" (مثال اس کے نور کی جو ایمان لایا) یعنی جو ایمان لے آئے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ایک نور عطا ہوتا ہے' اس نور کی مثال یہاں بیان ہو رہی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں "مَثَلُ نُوْرِهٖ" سے مراد ہے "مَثَلُ نُوْرِهٖ فِي قَلْبِ الْمُؤْمِنِ" (اس کے نور کی مثال جو

مومن کے قلب میں ہوتا ہے) گویا کہ یہاں مراد ہے نورِ ایمان ـــــ اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان حقیقی کے نور کا محل و مقام قلب ہے۔ جیسے کہ سورۃ الحجرات میں ایک جانب صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا کہ : ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ "لیکن اللہ نے ایمان کو تمہاری محبوب ترین متاع بنادیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھبادیا ہے"۔ (آیت نمبر۷) اور کچھ دوسرے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ : ﴿ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ "اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔" (آیت نمبر۱۴)

قلبِ مؤمن میں جو نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے آگے اس کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے۔ اب ذرا آپ غور کیجئے اور اپنے جسم کی ہڈیوں کے پنجر کو اپنے تصور میں لایئے تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں۔ "ڈایا فرام" جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے وہ اس کا فرش ہے اور اس پر قلب رکھا ہوا ہے۔ جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اب یہ ایک روشن چراغ کے مانند ہے کہ : ﴿ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ﴾ "جیسے ایک طاق ہو اور اس میں ایک چراغ رکھا ہو"۔ ﴿ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ﴾ "یہ چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہے"۔ ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر چراغ شیشے (فانوس) یا کسی قندیل میں نہ ہو تو چراغ کی لو ہوا سے اِدھر اُدھر منتشر ہوتی رہتی ہے۔ جب چراغ شیشے (فانوس) یا قندیل میں ہوتا ہے تو لو ایک مرکز پر مرتکز اور ایک جگہ قائم رہتی ہے جس سے روشنی بالکل یکساں طریقے اور ہموار طور پر اپنے ماحول میں سرایت کرتی ہے۔

اب آگے اس تمثیل کی اصل فصاحت و بلاغت آرہی ہے :

﴿ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾

"فانوس کی کیفیت یہ ہو جیسے چمکتا اور جگمگاتا ستارا۔ وہ چراغ جلتا ہو ایک ایسے بابرکت زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا روغن آپ

سے آپ بھڑک اٹھنے کے لئے تیار ہو' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو"۔

اس زیتون کے درخت کے متعلق حبر الاُمّۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے زیتون کا ایسا درخت مراد ہے جو کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے یا کسی میدان میں یکہ و تنہا کھڑا ہے۔ ایسے درخت پر صبح سے لے کر شام تک مسلسل دھوپ پڑتی ہے' گویا سورج کی حرارت و تمازت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر درختوں کا کوئی جھنڈ ہو تو اگر اس کے شرقی گوشے میں کوئی درخت ہو گا تو شام کی دھوپ اس کو نہیں ملے گی اور اگر غربی گوشے میں ہو گا تو صبح کی دھوپ سے محروم رہے گا۔ یہ ہے مفہوم "لَاشَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ" کا۔ حضرت ابن عباسؓ مزید فرماتے ہیں کہ ایسے درخت کے پھل کا تیل نہایت صاف و شفاف ہوتا ہے اور اس میں روشن ہونے کی استعداد بدرجہ تمام و کمال موجود ہوتی ہے۔ آیت کے اس حصے میں زیتون کے اس درخت کے روغن کی یہ خصوصیت و کیفیت بیان ہوئی ہے کہ وہ اتنا صاف و شفاف ہے کہ بھڑکنے اور مشتعل ہونے کے لئے بے تاب ہے' مچل رہا ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ جدید دور میں اگر ہم اس کی مثال دیں تو وہ پیٹرول ہے۔ مٹی کے تیل سے بھی دیا جلایا جاتا ہے' لیمپ اور لالٹین روشن کی جاتی ہے' سرسوں کے تیل سے بھی دیا جلا لیا جاتا ہے' لیکن ان سب کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے لئے بتی چاہئے' کپڑا چاہئے' تب وہ جلے گا۔ اس کو براہ راست دیا سلائی دکھائیں تو وہ نہیں جلے گا۔ اس کے برعکس پیٹرول کا معاملہ ہے کہ دیا سلائی اس سے ابھی دور ہے' قریب بھی نہیں آئی لیکن پیٹرول خود آگے بڑھ کر آگ کو پکڑنے اور بھڑک اٹھنے کے لئے بے تاب ہے۔ گویا یہاں ؎ "نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے!" والا انداز ہے۔

نورِ فطرت اور نورِ وحی کا امتزاج

پس اسی روغن سے درحقیقت ایک سلیم الفطرت انسان کی مثال دی گئی ہے جس نے اپنی انسانیت کے جوہر اور اپنی فطرت کی سلامتی کو محفوظ رکھا' اس میں کثافتیں نہیں آنے دیں۔ چنانچہ اس میں خواہشات و شہوات کی آلودگی پیدا ہونے دی' نہ جاہلی عصبیتوں کے

حجاب طاری ہونے دیئے۔ بلکہ وہ اپنی اصل حقیقت پر سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت کے ساتھ قائم و برقرار رہا۔ ایسے سلیم الطبع انسان کی فطرت کا یہ صاف و شفاف روغن بھڑک اٹھنے کو تیار رہتا ہے اور اگر نورِ وحی ذرا اس کے قریب آ جائے تو اس کا باطن جگمگا اٹھتا ہے۔ جیسے السابقون الاولون صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب نورِ وحی سے فی الفور جگمگا اٹھے تھے اور ان کی فطرتِ سلیمہ نے فوراً تصدیق کر دی تھی کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے نبی و رسول ہیں۔

درحقیقت یہ مثال ان صدیقین کے ایمان کی ہے کہ جو خود بیتاب ہوتے ہیں کہ جیسے ہی توحید و رسالت کی دعوت سامنے آئے اسے آگے بڑھ کر فی الفور قبول کر لیں۔ جیسے ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت کا بھی مطالعہ کیا تھا:

﴿رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا﴾

"اے ہمارے رب! ہم نے سنا ایک پکارنے والے کی پکار کو کہ دعوت دے رہا ہے ایمان کی کہ ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر' پس ہم ایمان لے آئے"۔

گویا یہ ہے وہ نورِ ایمان جس کے اجزائے ترکیبی دو ہیں' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ﴿نُورٌ عَلٰى نُورٍ﴾ "نور پر نور" ـــــ دو انوار سے مرکب ہو کر وہ نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس سے اولاً انسان کا قلب منور ہوتا ہے اور ایک روشن چراغ کی صورت اختیار کر لیتا ہے' پھر وہ طاق منور ہوتا ہے یعنی پورا سینہ روشن ہو جاتا ہے جس کی جانب اشارہ ہے ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ کے الفاظ مبارکہ میں' پھر ان انوار سے انسان کا پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے اور ایسے انسان کا وجود اپنی ذات میں خلقِ خدا کے لئے نورِ ہدایت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسی عمل کا بدرجۂ تمام و کمال ظہور ہوا ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کہ وہ مجسم نورِ ہدایت اور قرآن مجید کے الفاظ میں "سِرَاجًا مُّنِيرًا" بن گئے۔

خلاصۂ کلام یہ واضح ہوا کہ ایمان درحقیقت ایک نور ہے جو دو انور سے مرکب ہے' ایک نورِ فطرت اور دوسرے نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو "نُورٌ عَلٰی نُورٍ" وجود میں آتا ہے اس کا محل و مقام ہے قلب انسانی ـــــ اور ظاہر بات ہے کہ جب انسان کا باطن اس نور ایمان سے منور ہو جائے گا تو اس کے آثار و نتائج ظاہر ہوں گے انسان کے رویّے اور طرزِ عمل میں' اس کے اخلاق و کردار میں اور اس کی دلچسپیوں' امنگوں اور مشاغل میں ـــــ چنانچہ اس درس کی اگلی دو آیات (نمبر ۳۶' ۳۷) میں نورِ ایمان کے ان ہی آثار و مظاہر کا بیان ہے۔

ایمانِ حقیقی کے عملی مظاہر

ایمانِ حقیقی کے ان عملی مظاہر کا ایک رخ وہ ہے جس کی ایک جھلک درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۵ میں دکھائی جا چکی ہے' یعنی ایثار و قربانی' صبر و مصابرت' ثبات و استقلال' ہجرت و شہادت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ ـــــ اور دوسرا رخ وہ ہے جو سورۃ النور کی آیات ۳۶ تا ۳۸ میں سامنے آتا ہے اور ذکر و مناجات' تضرع و اخبات' خوف و خشیت اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

> "(نور ایمان کی جلوہ گاہیں) ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ ان میں ایسے جوانمرد صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں کوئی کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرپاتی۔ (اور اس سب کے باوجود) وہ ایک ایسے دن (کے تصور) سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گے ـــــ نتیجتاً اللہ انہیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا اور انہیں اپنے فضل سے مزید نوازے گا ـــــ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے!"

ان آیات میں پہلی بات تو یہ سامنے آئی کہ اس روئے ارضی پر خارجی اعتبار سے اس نور ایمانی کے سب سے بڑے مراکز مسجدیں ہیں۔ یہ اللہ کے وہ گھر ہیں جن میں اہلِ

ایمان ہر روز پانچ مرتبہ جمع ہوتے ہیں۔ نورِ ایمان کا یہ ارتکاز ان گھروں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے' یعنی ان کا ادب اور تعظیم کی جائے اور اس میں اس کا نام لیا جائے' یعنی اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ آیت کے اس حصے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک بہت ہی عمدہ اور پیارا قول ہمیں ملتا ہے' وہ فرماتے ہیں : "اَلمَساجدُ بیوتُ اللّٰہِ فی الارضِ' وھی تضییُ ءُ لاھلِ السماءِ کما تضییُ ءُ النّجومُ لاھلِ الارضِ" یعنی "مسجدیں زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور وہ آسمان والوں کو اسی طرح چمکتی نظر آتی ہیں جیسے زمین والوں کو ستارے چمکتے نظر آتے ہیں" ــــــ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نورِ ایمان کے' جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا تھا' سب سے بڑے مراکز اللہ کے یہ گھر ہیں' اور جن لوگوں کے دلوں میں وہ نور ایمان پیدا ہو جاتا ہے بلاشبہ ان کے قلبی اطمینان اور دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرکز یہ مسجدیں ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات قسم کے اشخاص وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ حشر کے میدان میں خاص اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا' جبکہ کسی کو بھی کہیں سایہ میسر نہیں ہو گا۔ ان میں ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہوں گے جن کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا : "ورجلٌ قلبُہٗ معلّقٌ بالمَساجدِ" یعنی "وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے"۔ وہ مسجد سے مجبوراً باہر نکلتا ہے کیونکہ اس کے گھربار کی مصروفیات بھی ہیں' کاروبار کی ضروریات بھی ہیں اور دیگر حوائج ضروریہ بھی ہیں' لیکن مسجد کے باہر اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال لیا گیا ہو۔ گویا وہ ایک ضرورت اور مجبوری کے تحت مسجد سے نکلتا ہے ورنہ اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے اور وہ منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی پھر اذان کی آواز آئے وہ فوراً لپک کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائے۔

یہاں مساجد کو بلند کرنے کا جو حکم آیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ مساجد کو بلند کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کا مفہوم مجرد تعمیر کرنا ہے۔ تعمیر کے لئے بھی کنایۃً لفظ "رفع" قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے' جیسے سورۃ البقرۃ میں آیا ہے :

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ﴾
"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اور ان کے ساتھ اسمٰعیل بھی"۔

ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مساجد کی تعظیم واحترام ہے' یعنی مسجد کو ہر نوع کی گندگی اور نجاست سے بھی پاک صاف رکھنا اور ہر قسم کے لغو کاموں اور لغو گفتگو سے بھی محفوظ رکھنا۔ یہ تو ہے ظاہری تعظیم واحترام جیسا کہ بیت الحرام کے متعلق اسی سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ○﴾
"اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں گے طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور وہاں رکوع و سجود (نماز) کے لئے آنے والوں کے لئے"

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مسجدیں نجاست معنوی یعنی شرک اور بدعت سے بھی پاک ہوں۔ بمصداق الفاظ قرآنی:

﴿وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا○﴾
"اور مساجد صرف اللہ ہی کے لئے ہیں' پس اس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو"

مزید بر آں الفاظ کے ظاہر سے یہ بھی متبادر اور مترشح ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر بلند رکھی جائے تاکہ وہ دور سے نظر آئے' اسے بستی میں نمایاں مقام حاصل ہو اور وہ اس بستی کا مرکز معلوم ہو۔ عربی بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اس کے اکثر الفاظ معنی و مفاہیم کا گنجینہ ہوتے ہیں' لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ یہاں "تُرْفَعَ" میں یہ تینوں مفاہیم شامل ہیں۔

آگے چلئے' ابھی اس آیہ کریمہ کے پہلے حصہ پر ہی تدبر ہو رہا ہے:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾
"ان گھروں میں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے"

یہاں ہمارے دین کی ایک جامع اصطلاح "ذکر" کا بیان ہوا۔ اس اصطلاح میں ہر نوع کا

ذکر آ گیا۔ نماز خود ایک ذکر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے : ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ "نماز قائم کرو میرے ذکر' میری یاد کے لئے" جبکہ سورۃ الحجر میں فرمایا : ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ ○﴾ "یقیناً ہم نے اتارا ہے یہ "الذکر" (یعنی قرآن مجید) اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ اور نگہبان ہیں" ——

سورۂ ھود میں فرمایا :

﴿وَجَاءَ کَ فِی ھٰذِہِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَۃٌ وَّذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ○﴾

"اور آیا (اے نبیؐ) آپ کے پاس اس (قرآن) میں بلاشبہ الحق اور نصیحت اور یاد دہانی اہل ایمان کے لئے"۔

گویا خود قرآن حکیم ذکر کامل بھی ہے اور ذکرِ مجسم بھی۔ ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَا اجْتَمَع قومٌ فِی بیتٍ مِن بُیوتِ اللّٰہِ یَتلُون کتابَ اللّٰہِ وَیَتدارَسونَہٗ بینھم اِلّا نزلت عَلیھم السّکینۃُ وَغشیتْھُمُ الرحمۃُ وحفّتھُمُ الملائکۃُ وذکرھُمُ اللّٰہُ فِیمن عِنْدَہٗ))

"جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں اس کی کتاب کے درس و تدریس اور افہام و تفہیم کے لئے تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے' رحمت الٰہی ان کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے' فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ملا اعلیٰ یعنی ملائکہ المقربین کی محفل میں ذکر فرماتا ہے (کہ اس وقت میرے کچھ بندے میرے گھر میں صرف میری کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں"۔

آگے چلئے' ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے بلند کرنے اور اپنے نام کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے' ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے : ﴿یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ "ان گھروں میں صبح کے وقت اور شام کے اوقات میں اس کی تسبیح کرتے ہیں"۔

یہاں صبح کے وقت کے لئے لفظ "غُدُوّ" آیا ہے۔ "غُدُوّ" مصدر ہے اس کی جمع نہیں ہوتی' قرآن مجید میں یہ لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے۔ آصال' اَصِیل کی جمع الجمع ہے'

"اَصِیل" کی جمع "اُصُل" اور اس کی جمع "آصَال" ہے۔ ان دو الفاظ "غُدُوّ" اور آصَال میں اشارہ ہے اس طرف کہ صبح کے وقت تو فرض نماز ایک ہی ہے' لیکن شام کے اوقات میں یعنی سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے رات کے تاریک ہونے تک چار فرض نمازیں ہیں' جن کا سلسلہ ظہر کی نماز سے شروع ہو کر عشاء کی نماز پر ختم ہو تا ہے۔ اسی کی طرف سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت مبارکہ میں اشارہ ہے :

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾

"سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے لے کر نماز کو قائم رکھو رات کے تاریک ہونے تک"۔

اس میں ظہر سے عشاء تک کی چار فرض نمازیں آگئیں' اور "قُرآنَ الفَجرِ" سے مراد صلوٰۃ الفجر ہے' اس طرح پانچ فرض نمازوں کا ذکر ہو گیا۔

دنیوی مصروفیات میں اہل ایمان کا طرز عمل

اب آگے چلئے ـــــ یہ کن لوگوں کا ذکر ہے؟ اور ان تسبیح و تحمید میں مشغول لوگوں کی اصل شان کیا ہے؟ فرمایا :

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾

"وہ (جواں ہمت) لوگ جنہیں غافل نہیں کر سکتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے"۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں "رِجَال" سے مراد صرف مرد ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں خواتین بھی شامل ہیں اور یہاں یہ لفظ کنایہ کے طور پر آیا ہے' اور اس سے مراد ہیں باہمت مرد و زن۔ اس لئے کہ اس دنیا میں ایک بندۂ مومن کے لئے نامعلوم کتنے دباؤ' کتنے موانع' کتنی تحریصات اور کتنی ترغیبات ہیں جن سے اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے' اور اگر وہ اللہ کے ساتھ لو لگائے رکھنا چاہتا ہے تو اسے نہایت شدید اور چومکھی کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونے کے لئے بڑی مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ ورنہ کہیں تجارت انسان کو غافل کر دے گی اور کہیں کوئی نفع بخش سودا اپنے اندر "گم" کر

لے گا۔ اس لفظ گُم سے بے اختیار ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

ایک خدا ناآشنا انسان دنیوی مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں گم ہو جاتا ہے' جبکہ جن لوگوں کا قلب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے منور ہو جاتا ہے اور وہ اللہ پر حقیقتاً اور واقعتاً ایمان لے آتے ہیں تو ان کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے : (ترجمہ) ان باہمت لوگوں کو غافل نہیں کرپاتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید و فروخت اللہ کی یاد سے"۔ یہاں "تجارت" عام ہے اور "بیع" خاص ہے۔ یہ عطف الخاص علی العام کی ایک مثال ہے۔ ویسے بھی بیع میں فوری طور پر کوئی منفعت پیش نظر ہوتی ہے جبکہ تجارت ایک وسیع تر اصطلاح ہے اور اس کا سلسلہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس میں غیر محسوس طور پر اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مضمون کی مناسبت سے تجارت پر بیع کا عطف کیا گیا ہے' اس لئے کہ جب کوئی سودا ہو رہا ہوتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اس سودے میں مجھے فوری طور پر کتنا نفع حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لہٰذا یہ وسوسہ دل میں پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ اگر اذان کی آواز آگئی ہے تو کیا ہوا؟ ذرا یہ سودا پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو مسجد کی جانب روانہ ہو جاؤں گا اور اگر جماعت چلی بھی جائے تو میں علیحدہ نماز پڑھ لوں گا' لیکن اس وقت یہ سودا چھوڑنا گھاٹے کا معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن ان باہمت لوگوں کا جن کے قلوب نور فطرت اور نور وحی سے روشن ہوتے ہیں حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرپاتی۔ اس موقع پر سورۃ المنافقون کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں لایئے جس میں فرمایا گیا کہ :

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○﴾

"اے اہل ایمان! تمہیں تمہارا مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو کوئی یہ طرز عمل اختیار کرے گا یقیناً وہی خسارے میں رہنے والے

ہیں"۔

اگر ان میں منہمک اور مشغول ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے تو جان لو کہ یہ بڑے خسارے کا سودا ہے۔ ان باہمت لوگوں کو کوئی تجارت اور خرید و فروخت نہ ذکرالٰہی سے غافل کر سکتی ہے' نہ ہی نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔ گویا نہ انسان دنیوی مصروفیات میں اتنا گم ہو جائے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام نہ رہے اور نہ مال کی محبت اس پر اتنی غالب آ جائے کہ زکوٰۃ ادا کرنی بھی دو بھر نظر آنے لگے۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ تو اصلاً قلب و نفس پر سے مال کی محبت کی گرہ کھولنے کا ذریعہ ہے۔ ورنہ تزکیۂ نفس کے لئے تو نہ صرف یہ کہ ہر سال نصاب کے مطابق زکوٰۃ دینی لازم ہے بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ابنائے نوع کی حاجت روائی اور مشکلات رفع کرنے کے لئے صدقاتِ نافلہ کا اہتمام لازم ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : ((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃ)) "بلاشبہ تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مستحقین کا حق ہے"۔ اور بطورِ استشہاد آپؐ نے آیت بر کا حوالہ دیا (سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷)' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں یعنی :

﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ' وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ﴾

"اور (حقیقی نیکی اس کی ہے) جس نے دیا مال اس کی محبت کے علی الرغم قرابت داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سائلوں کو اور گردن چھڑانے میں اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔"

آگے فرمایا کہ مساجد سے اتنی محبت اور ذکر و شغل کے دوام اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے التزام کے باوصف ان باہمت لوگوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ ان میں اپنی دینداری کا کوئی تکبر' کوئی عُجب' کوئی پندار اور کوئی گھمنڈ پیدا ہو جائے' بلکہ ان تمام حسنات اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ "یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝" یعنی وہ لرزہ براندام رہتے ہیں' کانپتے رہتے ہیں' لرزاں و

ترساں رہتے ہیں اس دن کے خیال سے جس کی ہولناکی کا عالم یہ ہے کہ اس دن دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ یہ کنایہ اور استعارہ ہے قیامت کی ہیبت اور اس کے شدائد و مصائب کے لئے۔ وہ دن جس کے لئے سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿ یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبًا ﴾ "وہ دن کہ جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا"۔ یہ باہمت لوگ اللہ سے لو لگانے اور ہر دم اس کی یاد کا التزام کرنے کے باوجود اس دن کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس دن ہر ابن آدم عدالت خداوندی میں محاسبہ کے لئے کھڑا ہو گا۔

آگے فرمایا: ﴿ لِیَجۡزِیَہُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا ﴾ "تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے ان کے بہترین اعمال کی"۔ یہاں ابتدا میں جو حرف جار یعنی "لام" آیا ہے اسے لام عاقبت کہا جاتا ہے۔ گویا کنایہ مقصود ہے کہ اصحاب ایمان و یقین کی ان کیفیات کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا دے گا۔ قرآن حکیم کے اکثر مترجمین نے "اَحۡسَنَ" کی نسبت "جَزَاء" سے قائم کی ہے' یعنی اللہ انہیں ان کے اعمال کی بہت عمدہ' اعلیٰ اور احسن جزا دے گا۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ "اَحۡسَنَ" کا تعلق "مَا عَمِلُوۡا" سے ہے' اس لئے کہ قرآن حکیم کے بعض دوسرے مقامات پر (جیسے سورۃ النحل کی آیات ۹۶ اور ۹۷) اعمالِ صالحہ کی اخروی جزا کے ذکر میں "اَحۡسَنَ" کے ساتھ حرف جار "بِ" بھی آیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اہل جنت کے اجر کا فیصلہ اور ان کے مرتبہ و مقام کا تعین ان کے بہترین اعمال کی مناسبت سے کرے گا' اس لئے کہ اچھے سے اچھے انسان کے بھی تمام اعمال برابر اور مساوی قدر و قیمت کے حامل نہیں ہوتے، ان میں کچھ نہ کچھ فرق و تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ہر انسان سے کچھ نہ کچھ کوتاہیاں اور خطائیں بھی ضرور سرزد ہو جاتی ہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ "الانسانُ مرکبٌ من الخطأ وَالنِّسیان" یعنی انسان دو چیزوں کا پتلا ہے' اس سے غلطی کا ارتکاب اور خطا صدور بھی ہو جاتا ہے اور بھول چوک تو اس کی جبلت اور خمیر ہی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعمال میں سے جو بہترین اور چوٹی کے اعمال ہوں گے ان کے اعتبار سے حساب لگایا جائے گا اور ان کی جزا ان کے اعلیٰ ترین اعمال کی مناسبت سے مترتب ہو گی۔ کم تر درجے کے اعمال نظر

انداز کر دیئے جائیں گے اور جو کوتاہیاں اور خطائیں ہوں گی انہیں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ غفّاری و رحیمی سے ان کے نامہ اعمال میں سے حذف کر دے گا۔ گویا انہیں اپنی شانِ ستّاری سے ڈھانپ لے گا۔ جیسا کہ ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعے کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ "میں لازماً ان کی برائیوں کو ان سے دور کردوں گا"۔ جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حیاتِ دنیوی کے دوران ان کے دامن کردار کے داغ دھبے دھودے گا اور ان کے نفوس کا تزکیہ فرمادے گا۔ اور یہ بھی کہ آخرت میں ان کے نامہ اعمال کی سیاہی کو دھودے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ : ﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ "اور میں لازماً ان کو ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی"۔ یا جیسے سورۂ ھود میں یہ اصول بیان فرمایا : ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ "یقیناً بھلائیاں برائیوں کو محو کردیتی ہیں"۔ لہٰذا ان باہمت لوگوں کا آخرت میں جو مقام اور مرتبہ معین ہوگا وہ ان کے اعلیٰ اور احسن اعمال کی نسبت و مناسبت اور اعتبار سے ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جیسے دنیا میں اُجرت محنت و مشقت کی نسبت سے ملتی ہے اسی طرح آخرت میں اجر اور جزا کا معاملہ تو اعمال صالحہ کی مناسبت سے ہی ہوگا خواہ اعلیٰ ترین اعمال ہی کی مناسبت سے ہو۔ اس پر مزید ہے وہ فضل جو اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے عنایت فرمائے گا۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ "اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے مزید عطا فرمائے گا"۔ واضح رہے کہ یہ فضل کسی محنت کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی دین ہے' لہٰذا یہ کسی حساب کتاب کی پابند نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی شان جود و سخا کا ظہور ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ "اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے بلا حد و حساب"۔ گویا اس کا فضل بلانہایت ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہے۔

اس مقام پر تھوڑا سا توقف فرما کر آج کے سبق کو گزشتہ سبق سے ملا کر ایک حقیقی بندۂ مومن یا بقول اقبال "مردِ مومن" کی شخصیت کا مکمل نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارا درس ششم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات پر

مشتمل تھا۔ اس میں بھی ایمان کی ترکیب بیان ہوئی تھی کہ ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ اور پھر ایمان بالرسالت کیسے وجود میں آتا ہے! اس کے بعد ایک جامع آیت میں بندۂ مومن کی سیرت و کردار کی تصویر کے ایک رخ کی حیثیت سے سامنے لایا گیا تھا وہ نقشہ جس کے خدوخال تھے سعی و جہد' ایثار و قربانی' جہاد و قتال اور صبر و مصابرت۔ چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ الفاظ تھے :

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِىْ سَبِيْلِىْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾

"جن لوگوں نے میرے لئے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں (تکلیفیں دی گئیں) اور جنہوں نے میرے لئے جہاد و قتال کیا اور اپنی جانیں قربان کر دیں"۔

یہ ہے بندۂ مومن کی سیرت و کردار کی تصویر کا ایک رخ یعنی جِدّ و جُہد' کوشش و محنت' کشمکش و تصادم' صبر و ثبات' ایثار و قربانی' جہاد و قتال حتیٰ کہ جان کا نذرانہ پیش کر دینا۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ مساجد کے ساتھ ایک قلبی انس' ذکرِ الٰہی کے دوام اور ان کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے اور اس میں ذوق و شوق' ذکر و شغل اور انابت و اطاعت پر سونے پر سہاگے کی مثال ہے خوف اور خشیتِ الٰہی' جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں اور تصویر کا صحیح تصور ان دونوں رخوں ہی سے مکمل ہوتا ہے' اسی طرح اگر بندۂ مومن کی شخصیت کا بھی صرف ایک رخ سامنے رہے گا تو شخصیت بھی یک رخی رہے گی۔ چنانچہ اسی کے مظاہر آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں! اصل میں ایک مردِ مومن یا انسانِ مطلوب کی شخصیت کے یہ دونوں رخ مطلوب ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک بندۂ مومن کی شخصیت میں یہ دونوں رخ بیک وقت موجود ہوں۔ چنانچہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں یہ دونوں رنگ بتمام و کمال اور بیک وقت نظر آتے ہیں اور اس کی گواہی دشمنوں تک نے دی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ "اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ" یعنی "اصل فضیلت وہی

ہے جس کی گواہی دشمن دیں"۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں جب سلطنتِ کسریٰ سے مسلح تصادم ہوا تو ایرانی افواج کے جاسوسوں اور مخبروں نے مسلمان افواج کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر اپنے سپہ سالار کو جو رپورٹ دی تھی اس کے یہ الفاظ نہایت قابل غور ہیں اور ان کی ذہانت و فطانت پر دلالت کرتے ہیں کہ "ھُم رُھبانٌ بِاللَّیلِ وَ فرُسانٌ بِالنّھار" یعنی یہ عجیب لوگ ہیں' دن میں یہ شہسواروں کے روپ میں نظر آتے ہیں اور میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہیں اور رات کے وقت یہی لوگ راہب بن جاتے ہیں اور مصلوں پر کھڑے نظر آتے ہیں اور ان کے آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہیں تر ہو جاتی ہیں اور اسی طرح اپنے رب کے حضور الحاح و زاری میں اپنی راتوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے ہیں۔

پس ایک بندۂ مومن کی مکمل شخصیت "ھُم رھبانٌ بِاللَّیلِ وَفرُسانٌ بِالنَّھار" کے امتزاج ہی سے وجود میں آتی ہے۔ ہمارے سامنے "فرُسانٌ بِالنَّھار" والارخ گزشتہ سبق میں آیا تھا اور "رُھبانٌ بِاللَّیلِ" کی صحیح تعبیر آج کے سبق میں سامنے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ادنیٰ درجے میں ہی سہی ان اوصاف کا جامع مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے جو ان دو اسباق میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آمین یا ربَّ العالمین۔

ظلمتِ کفر کے دو درجے

اب ہم اس رکوع کی آخری دو آیات مبارکہ پر کسی قدر غور و تدبر کرنے کی کوشش کریں گے۔ آیئے پہلے ان آیات کا ایک سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں :

﴿ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ

یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍO﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب (یعنی دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت) جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی۔ البتہ اللہ کو اس کے پاس موجود پاتا ہے جو اس کا حساب چکا دیتا ہے' اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یا ان اندھیروں کے مانند جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج اور اس پر سایہ کئے ہوں بادل۔ گویا تاریکیاں ہیں تہہ بر تہہ۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہ فرمائے اس کے لئے کوئی روشنی نہیں!"

ترجمے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان آیات میں کفر کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے دو تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جو عربی کے ایک مقولے میں سامنے آتا ہے کہ تُعرفُ الاشیاءُ بِاَضدادِھا "اشیاء کی صحیح معرفت ان کے اضداد کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے"۔ یعنی کسی شے کی حقیقت کو ایک تو آپ خود اس شے پر غور و فکر کر کے سمجھ سکتے ہیں اور دوسرے اس طور سے کہ اس چیز کی ضد پر غور کیا جائے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے' تو اس سے بھی اس شے کی حقیقت پر روشنی پڑے گی اور وہ منقح اور واضح ہو کر شعور و ادراک کی گرفت میں آجائے گی۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ دن کی اصل حقیقت رات کے پس منظر میں خوب نمایاں ہوتی ہے۔ اور روشنی کی حقیقت تاریکی کے تقابل میں زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایک طرف تو سورۃ النور کی آیت نمبر ۳۵ میں نہایت فصیح و بلیغ تمثیل سامنے آچکی ہے جس میں ایمان کو ایک نور سے تشبیہ دی گئی جو مرکب ہے دو انوار سے۔ ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس کا محل و مقام ہے قلبِ انسانی۔

اس کے بعد آیات ۳۶ تا ۳۸ میں ایمان کے اس نورِ باطنی کے انسانی شخصیت میں ظہور کی دو صورتوں میں سے ایک کو نہایت فصیح اور بلیغ الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ اسی حقیقتِ ایمان کو مزید اجاگر کرنے کے لئے آیات ۳۹' ۴۰ میں ایمان حقیقی کے نور سے محروم

انسانوں کی شخصیت کی جھلک دو تمثیلوں کے پیرائے میں دکھادی گئی۔ مجرد الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان تمثیلوں میں سے پہلی تمثیل میں کچھ روشنی اور تاریکی کے بین بین کی سی کیفیت سامنے آتی ہے' جبکہ دوسری تمثیل میں تاریکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم دقّتِ نگاہ سے مشاہدہ کیا جائے تو ان ظاہری الفاظ کے پردوں میں ہدایت و حکمت کے نہایت قیمتی موتی چھپے ہوئے ہیں۔

ان تمثیلوں پر غور کرنے سے قبل ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ جیسے ایمان کی تمثیل میں بھی قانونی نہیں حقیقی ایمان کی ماہیت بیان کی گئی ہے اسی طرح یہاں کفر سے مراد قانونی اور ظاہری کفر نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی کفر ہے۔ مبادا ہم یہ گمان کرلیں کہ یہاں صرف غیر مسلموں اور کھلے کافروں کے متعلق بات ہو رہی ہے اور ہم مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ گمان اور مغالطہ لاحق ہو گیا تو ان آیاتِ مبارکہ میں قرآن حکیم کی جو ہدایت اور رہنمائی ہے' اس سے ہم محروم رہ جائیں گے۔ واضح رہے کہ جس طرح قانونی ایمان کا تعلق صرف "قول" سے ہے اور اس کی اساس شہادت پر ہے' یعنی "اَشْھَدُ اَنْ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلَ اللّٰہِ" اور حقیقی ایمان کا تعلق تصدیقٌ بالقلب سے ہے اور وہ عبارت ہے یقینِ قلبی سے' اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں اور دو درجے ہیں۔ ایک کفر قانونی اور ظاہری ہے یعنی کھلم کھلا انکار اور ایک کفر باطنی اور مخفی ہے' یعنی ظاہر میں تو اقرار ہے لیکن باطن میں انکار چھپا ہوا ہے' چنانچہ قول کے مطابق عمل موجود نہیں ہے۔ اس کفرِ حقیقی کے بارے میں ہمارے ایک درویش جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے' بڑے کیف کے عالم میں کہا کرتے تھے کہ "جو دم غافل' سو دم کافر" یعنی انسان کا جو وقت بھی غفلت میں بیتتا ہے وہ ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے' جیسے کہ گزشتہ صفحات میں علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کا حوالہ آیا تھا کہ ۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

الغرض اگر کوئی مسلمان غفلت کے عالم میں ہو' اللہ کو بھولے ہوئے ہو' اللہ سے محجوب ہو گیا ہو' پردے میں آگیا ہو تو یہ گمشدگی کی کیفیت ہے جو ایک نوع کا کفر ہے' اگر چہ

اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ مزید بر آں' کفر کے ایک معنی ناشکرا پن بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں وہی مراد ہو۔ بہر حال یہاں کفر کے لئے جو تمثیلیں بیان ہو رہی ہیں' وہ کفرِ حقیقی اور کفرِ معنوی کی ہیں' صرف کفرِ قانونی یا کفرِ فقہی کی نہیں۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جس میں انسان کا قلب ایمان کے حقیقی نور اور حقیقی روشنی سے محروم ہو' قطع نظر اس سے کہ ظاہری اور قانونی طور پر وہ مسلمان ہو یا کھلم کھلا بھی کفر ہی کا اظہار کر رہا ہو۔

دوسری تمثیل۔ ایمانِ حقیقی سے محروم لوگوں کا انجام

اب اس کفرِ حقیقی و معنوی کی بھی دو کیفیات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص ایمانِ حقیقی کے لوازم یعنی اللہ کی ہستی اور توحید کے یقین اور اس کے ساتھ خلوص و اخلاص کے تعلق اور آخرت کے یقین اور اخروی فلاح کے حصول کے جذبے سے تو قطعاً محروم ہو لیکن کسی دوسرے جذبے یا سبب سے کوئی نیکی' کوئی بھلائی اور کسی نہ کسی نوع کا رفاہ عام اور خدمتِ خلق کا کام کر رہا ہو' جیسے کسی نے کوئی یتیم خانہ کھلوا دیا ہو یا کوئی کنواں کھدوا دیا ہو یا کوئی شفاخانہ اور اسپتال بنوا دیا ہو' یا رفاہی مقاصد کے لئے کوئی فاؤنڈیشن قائم کر دی ہو یا کوئی خیراتی ادارہ قائم کر دیا ہو۔ اگر یہ سارے کام اللہ کی رضاجوئی اور آخرت کی فوز و فلاح کے حصول کے جذبے کے سوا کسی اور جذبہ محرکہ کے تحت صادر ہو رہے ہیں تو ان اعمال کی حقیقت پہلی تمثیل میں بیان ہوئی ہے' یعنی :

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔"

یہ ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل ہے' اس لئے کہ دنیا بھر میں یہ بات معروف و معلوم ہے کہ ایک لق و دق صحرا' ایک چٹیل میدان اور وسیع و عریض ریگستان میں ریت کا ایک حصہ اس طرح چمکتا ہے کہ دور سے دیکھنے والے کو وہ پانی نظر آتا ہے اور پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں "ظَمْاٰن" کا لفظ "فَعلان" کے وزن پر آیا ہے۔ اسی وزن پر "رَحمان" آتا ہے' یعنی وہ ہستی جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے

مانند ہو۔ چنانچہ "ظَمْآن" کے معنی ہوں گے وہ شخص جو پیاس سے مرا جا رہا ہو۔ اسے ریگستان میں دور سے پانی نظر آرہا ہے اگرچہ وہ پانی نہیں ہے محض سراب ہے' لیکن وہ اسے پانی سمجھ کر جس طرح بھی ہو گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا وہاں پہنچتا ہے' لیکن وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ :

﴿حَتّٰی اِذَا جَاءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْـًٔا﴾

"یہاں تک کہ جب وہ اس (سراب) کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی"۔

اس کی حسرت کا اندازہ کیجئے کہ وہ گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا پانی کی امید میں وہاں پہنچتا ہے تو اس کو پانی نہیں ملتا جبکہ وہ وہاں موت کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ اور موت کیا ہے؟ وہ تو درحقیقت "شاہدرہ" ہے جس سے گزرنے کے بعد اسے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے' لہٰذا فرمایا :

﴿وَوَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ﴾

"اور وہ وہاں اللہ کو موجود پاتا ہے' پس وہ اس کا حساب چکا دیتا ہے"۔

آیت کے اس پورے حصے کا جس کا ہم نے اب تک مطالعہ کیا ہے مطلب و مفہوم یہ ہے کہ ایسا شخص جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو گا تو اس کو تو گمان ہو گا کہ میں نے دنیا میں بڑے نیک کام کئے تھے' میں نے خیراتی ادارے قائم کئے تھے' میں نے فاؤنڈیشن قائم کئے تھے' میں نے یتیم خانے' شفاخانے اور اسپتال بنوائے تھے اور متعدد رفاہِ عام کے کام کئے تھے' میں نے ان اداروں کی بلامُزد اعزازی طور پر بے شمار خدمات انجام دی تھیں۔ لہٰذا اسے ان اعمال پر بہت کچھ تکیہ ہو گا' ان کا سہارا ہو گا' لیکن جیسے ریگستان میں دور سے چمکتی ہوئی ریت پیاسے کو پانی نظر آتی ہے حالانکہ وہ سراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا' ایسے ہی جب ایسا شخص عدالت خداوندی میں محاسبہ کے لئے کھڑا ہو گا تو اسے معلوم ہو گا کہ چونکہ ان اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی بلکہ وہ نور ایمان سے خالی اور محض ریاکاری کے جذبے کے تحت شہرت اور ناموری کے حصول کے لئے یا کسی دنیوی منفعت اور مصلحت کے تحت یعنی انکم ٹیکس بچانے کے لئے یا الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے یا سرکار دربار میں رسائی و پذیرائی کے لئے کئے گئے تھے' لہٰذا ان کی آخرت میں کوئی وقعت نہیں ہو گی بلکہ وہاں ان کی حیثیت کھوٹے سکوں کی ہو گی۔ گویا یہ تمام اعمال وہاں سراب ثابت

ہوں گے' جیسے دور سے چمکتی ہوئی ریت پانی نظر آتی ہے جبکہ حقیقت میں پانی موجود نہیں ہوتا۔ ویسے ہی ان کے یہ اعمال جو ظاہری صورت کے اعتبار سے نیکی اور خیر کے اعمال نظر آتے ہیں' آخرت میں لاحاصل اور بے نتیجہ رہیں گے اور اللہ ان کا حساب چکا دے گا۔ اور اس کی شان یہ ہے کہ

﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝﴾

"اور اللہ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی"۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام "الحسیب" بھی ہے۔ وہ قیامت کے دن ہر انسان کی دنیوی زندگی کے تمام اعمال ہی نہیں بلکہ اس کی نیتوں' اس کے ارادوں اور اس کے محرکاتِ عمل کا پورا حساب لے گا۔ اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کو کسی جمع تفریق کی ضرورت نہیں ہوگی جو ہمیں ہوتی ہے۔ اس کے کمپیوٹرز کا کوئی تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ سورۃ الکہف میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب اعمال نامہ سامنے آئے گا تو مجرم لرز اٹھیں گے اور کہیں گے :

﴿ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا﴾

"ہائے ہماری شامت! یہ اعمال نامہ کیسا ہے کہ اس نے کسی بڑی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہی نہیں کہ جس کا احاطہ نہ کر لیا ہو"۔

اس میں تو باریک ترین تفصیلات کو بھی نہیں چھوڑا گیا' چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی اس میں موجود ہے اور بڑی سے بڑی بات کا بھی یہ احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی بات سورۃ الزلزال میں فرمائی گئی :

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۚ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾

"جو کوئی ذرے کے ہم وزن نیکی کرے گا اپنے سامنے موجود پائے گا اور جو کوئی ذرے کے ہم وزن بدی کمائے گا تو اسے بھی دیکھ لے گا"

یاد ہوگا کہ اس سلسلۂ دروس کے درس دوم یعنی آیۂ بِر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقی نیکی کیا ہے!

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾

"بلکہ حقیقی نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یومِ آخر پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور نبیوں پر۔"

گویا کوئی عمل جس کی بنیاد میں ایمان نہیں ہے حقیقتاً نیکی نہیں ہے چاہے بظاہر وہ نیکی کا کتنا ہی بڑا عمل نظر آتا ہو' حتیٰ کہ نماز' روزہ اور صدقہ و خیرات تک کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر ان کا مقصد ریاکاری ہو اور یہ کام شہرت کے حصول یا لوگوں پر اپنی دین داری کی دھونس جمانے کے لئے کئے جائیں تو عین شرک قرار پائیں گے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے :

((مَن صَلّٰی یُرائِی فقد اَشرَکَ' وَمن صامَ یُرائی فقد اَشرکَ' ومن تصدَّقَ یرائی فقد اَشرَکَ))

"جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لئے اس نے شرک کیا' اور جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لئے اس نے شرک کیا' اور جس نے صدقہ و خیرات کیا دکھاوے کے لئے اس نے بھی شرک کیا"۔

یعنی اگر اعمال کی بنیاد ایمانِ حقیقی پر ہے اور وہ خالصتاً اللہ کی رضاجوئی اور آخرت کی جزاطلبی کے جذبے کے تحت صادر ہو رہے ہیں تب تو وہ واقعتاً نیکی قرار پائیں گے اور موجبِ اجرو ثواب ہوں گے' بصورتِ دیگران کی حیثیت محض سراب کی سی ہے!

قرآن مجید میں دو اور مقامات پر بھی یہ مضمون دو نہایت حسین و جمیل تمثیلوں کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ ایک تو سورۃ النور کے فوراً بعد سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۝﴾

"(جنہیں یہ لوگ بڑے بڑے عمل سمجھ رہے ہیں اور جن پر انہوں نے تکیہ کیا ہوا ہے) ہم قیامت کے دن ان کے ان اعمال کی طرف بڑھیں گے اور انہیں ہوا میں اڑا دیں گے۔"

بلا تشبیہ نقشہ بالکل وہی ہو گا جیسے ٹھوکر مار کر کسی چیز کو مشتِ غبار کی صورت ہوا میں اڑا دیا

جاتا ہے' اس لئے کہ ان کے اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی اور وہ خالصتاً اللہ کے لئے نہیں کئے گئے تھے۔ دوسری تشبیہ سورۂ ابراہیم میں وارد ہوئی ہے۔

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹰاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ﴾

"جن لوگوں کو اپنے رب پر ایمان میسر نہیں ہے' ان کی نیکیاں اور ان کے اعمال اس راکھ کے مانند ہیں جسے کسی جھکڑ والے دن تیز ہوا اڑا کر لے جائے۔"

گویا ان کے لئے نہ کوئی جماؤ اور ٹھہراؤ ہے اور نہ ثبات و دوام۔ آگے ارشاد ہوتا ہے :

﴿ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ' ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ○﴾

"جسے وہ اپنی کمائی اور کسب سمجھ رہے ہوں گے اور اس پر اجر و ثواب کی امیدیں لگائے بیٹھے ہوں گے' اس میں سے ان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آسکے گا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ہے بہت دور کی گمراہی اور سب سے بڑی محرومی و ناکامی۔"

الغرض کفر کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان حقیقی ایمان سے محرومی کے باعث خلوص و اخلاص سے تو تہی دست و تہی دامن ہو لیکن مضطرب ضمیر کے لئے جھوٹا اطمینان فراہم کرنے کی غرض سے یا شہرت و عزت کے حصول کی خاطر یا کسی دنیوی منفعت و مصلحت کے لئے نیکی کے کام سرانجام دے رہا ہو تو آیت زیر درس کی رو سے ایسی نیکیاں اور اس قسم کے اعمالِ خیر محض سراب کا درجہ رکھتے ہیں۔

اِس سراب کے دھوکے میں گرفتار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ حقائق سے محجوب ہوتے ہیں اور فکر و نظر کی سطح پر مختلف النوع تاریکیوں اور اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان تاریکیوں اور اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانا ان حضرات کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان سے بہرہ ور فرمایا ہو۔ جیسے سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول جناب محمد ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا :

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

"وہی ہے (اللہ) جو اپنے بندے (ﷺ) پر (قرآن مجید کی) روشن آیات نازل

فرمارہا ہے تاکہ وہ تمہیں (کفر و ناشکری کے) اندھیروں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لے آئے"۔

اب جن کی بھی آنکھیں کھل گئی ہوں اور جن کو بھی نورِ ایمان کی کوئی رمق میسر آگئی ہو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ابنائے نوع کو ایمانِ حقیقی کی دعوت دیں' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

﴿لا یُؤمنُ احدُکم حتّٰی یحبَّ لاخیہِ ما یحبُّ لِنفسہٖ﴾
"تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک (حقیقی) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔

لہٰذا اگر ایمان حقیقی کی روشنی کسی کو میسر آگئی ہے تو اس کو عام کرنا اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے اور یہ کام اس پر واجب اور فرض ہے!

تیسری تمثیل۔ کفر کا آخری اور انتہائی درجہ

کفر کا دوسرا اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ایمان سے محرومی پر مستزاد ضمیر بھی بالکل مردہ ہو چکا ہو اور نیکی اور بدی کی تمیز بھی سرے سے مفقود ہو چکی ہو۔ چنانچہ اب انسان کی شخصیت و کردار میں سوائے عریاں نفس پرستی کے اور کچھ نہ رہے اور نیکی اور بھلائی ملمع کے درجہ میں بھی موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری تمثیل میں یہ انتہائی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ روشنی کی کوئی ایک کرن بھی موجود نہیں' بلکہ انتہائی تاریکی اور تہہ بر تہہ ظلمتیں ہیں۔ یعنی کامل خود غرضی ہے اور خواہشات و شہوات ہی کی پیروی ہے اور انسان ہوائے نفس ہی کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ کی نیکی اور دکھاوے کا خیر بھی موجود نہیں اور کوئی بھلائی خواہ وہ ملمع ہی کی نوعیت کی ہو اس کی بھی کوئی کرن سیرت و کردار میں نظر نہ آئے۔ یہ گویا ضلالت' گمراہی اور گراوٹ کی آخری انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کیفیت کو یوں تعبیر فرمایا گیا : ﴿ظُلُمٰتٌ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ﴾ "تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں"۔ اس ظلمتِ مطلق اور تاریکیِ محض کے لئے جو تمثیل یہاں دی گئی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی امیر البحر اسی کی بناء پر ایمان سے مشرف ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے زندگی بھر کبھی سمندری سفر نہیں کیا'

جبکہ اس تمثیل کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ تمثیل صرف وہی شخص دے سکتا ہے جس کی بیشتر زندگی سمندر کے سفر میں گزری ہو اور اسے گہرے سمندر میں اکثر طوفانوں سے سابقہ درپیش آیا ہو اور اسے ذاتی تجربہ ہو کہ سمندر کی گہرائی میں اندھیرے کی کیا کیفیت ہوتی ہے جبکہ موجوں پر موجیں چڑھی چلی آ رہی ہوں اور اوپر گہرے بادل بھی ہوں کہ ستاروں کی کوئی چمک بھی پانی میں منعکس نہ ہو رہی ہو۔ ایسی مکمل تاریکی کا کوئی تخیل و تصور کسی عام انسان کے لئے ممکن نہیں ہے' لہٰذا یہ تمثیل اور تشبیہ یا تو وہ شخص دے سکتا ہے جسے عملاً کسی اندھیری رات میں جبکہ گہرے بادل بھی چھائے ہوئے ہوں سمندر میں کسی طوفان سے سابقہ پیش آیا ہو اور پھر وہ قادر الکلام بھی ہو اور فصاحت و بلاغت سے بدرجۂ تمام و کمال بہرہ ور ہو! یا پھر ایسی تمثیل اور تشبیہ صرف اللہ ہی بیان کر سکتا ہے جو کل کائنات کا خالق و مدبّر ہے۔ لہٰذا انہوں نے تسلیم کیا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آئے۔

اب ذرا تمثیل کے الفاظ پر توجّہ مرکوز کیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا﴾

"یا جیسے وہ اندھیرے جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جسے ڈھانپے ہوئے ہو موج' پھر اس کے اوپر چڑھی آ رہی ہو ایک اور موج' اور (پھر مطلع بھی صاف نہ ہو بلکہ) اس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوں۔ گویا تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا"۔

گھُپ اندھیرے کے لئے ہماری زبان کا بھی محاورہ ہے "ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا"۔ اس لئے کہ ایک انسان جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے سمت کا شعور تو حاصل ہوتا ہے اور خوب اندازہ ہوتا ہے کہ میرا ہاتھ کدھر ہے' لیکن اگر وہ اس کے باوجود اپنے ہاتھ کو بھی دیکھ نہیں پا رہا تو معلوم ہوا کہ انتہائی تاریکی ہے اور روشنی کی کوئی رمق بھی موجود نہیں! سبحان اللہ وبحمدہٖ یہ ہے تمثیل کی معراج اور تشبیہ کا کمال!

اب اس آیتِ مبارکہ کے آخری حصہ پر توجہ فرمایئے۔ارشاد فرمایا :

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ○﴾

"اور جس کو اللہ ہی نے نور عطا نہ فرمایا ہو' اس کے لئے کوئی نور نہیں!"

نور تو اصل میں ایمان ہے' اگر ایمان میسر نہیں تو پھر نور کہاں؟ اس صورت میں تو تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں!!

اس درس کے آغاز میں عرض کیا گیا تھا کہ جیسے نورِ خارجی اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے ویسے ہی نورِ باطنی حقائق کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا نورِ ایمان نہ ہو تو حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اسی کو بصیرت یعنی باطنی مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ رہی ہماری ظاہری بصارت تو وہ حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ کسی عارف کامل نے کیا خوب کہا ہے ۔

دم چیست؟ پیامے است ! شنیدی نہ شنیدی ؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است نہ دیدی ؟
دیدن . دگر آموز! شنیدن دگر آموز!!

یعنی یہ سانس کی آمد و رفت کیا ہے؟ ایک پیغام ہے! تم سنتے ہو یا نہیں سنتے؟ اور تمہارا خاکی وجود ایک نور کی جلوہ گاہ بھی ہے! تم دیکھتے نہیں؟ تو تمہیں چاہئے کہ (حیوانی سمع و بصر سے بلند تر سطح پر) ایک دوسری ہی طرح کا دیکھنا بھی سیکھو اور سننا بھی! واقعہ یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کے بغیر انسان اس "دیدنِ دگر" اور "شنیدنِ دگر" سے محروم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ دعا تو بہت ہی مشہور ہے کہ ((اَللّٰهُمَّ اَرِنِی حَقِیقَةَ الاشیاءِ کَمَا هِیَ﴾ یعنی "اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الحقیقت ہیں!" علاوہ ازیں صحیح بخاری' صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں یہ دعا بھی منقول ہے جو آنحضور ﷺ خاص طور پر فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پڑھا کرتے تھے۔

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فی قلبی نُورًا وَفی بَصَری نورًا وَفی سَمعی نورًا وعَن یمینی نورًا وعَن یَساری نورًا وفَوقی نورًا وتَحتی نورًا واَمامِی نورًا وخَلفی نورًا وَاجْعَل لِی نورًا وَفِی لسانی نورًا وفی عصَبی نورًا ولَحمِی نورًا ودَمِی نورًا وشَعرِی نورًا

وَبَشَرِى نُوْرًا وَاجْعَلْ فِى نَفْسِى نُوْرًا وَعَظِّمْ لِى نُوْرًا، اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِى نُوْرًا))

"اے اللہ! میرے دل میں نور عطا فرما' میری بصارت میں نور عطا فرما' میری سماعت میں نور عطا فرما' میری داہنی جانب سے نور دے اور میری بائیں جانب سے بھی نور عنایت کر' اور میرے اوپر سے نور دے اور میرے قدموں تلے سے نور دے' اور میرے سامنے سے نور دے اور میری پشت کے پیچھے سے نور دے اور میرے لئے نور ہی نور کر دے! اور میری زبان میں نور دے اور میرے رگ و پے میں نور بھر دے اور میرے گوشت میں نور بھر دے اور میرے خون میں نور بھر دے اور میرے بالوں میں نور بھر دے اور میری کھال میں نور دے' میری جان کو نور سے لبریز کر دے اور میرے نور کو فراخ و وسیع فرما دے اور مجھے نور ہی نور عطا کر!"

اس سبق کی پہلی آیت (نمبر ۳۵) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ "اللہ ہدایت بخشتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے" اور چونکہ ہدایت کے مفہوم میں رہنمائی یعنی راستہ دکھا دینے سے لیکر منزلِ مقصود تک بالفعل پہنچا دینے کے جملہ مراحل داخل ہیں لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ رسائی عطا فرما دیتا ہے اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ ولولہ' یہ امنگ اور یہ آرزو پیدا فرما دے کہ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہیں کفر و شرک' الحاد و زندقہ' مادہ پرستی اور ریاکاری اور منافقت اور قول و عمل کے تضاد کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و یقین کی روشنی میں آجانے کی توفیق مل گئی ہو! آمین یا رب العالمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○○

انٹرنیٹ کی سہولت رکھنے والوں کے لئے E-mail اور Web page کا ایڈریس

E-mail : anjuman@brain.net.pk

URL. http://www.tanzeem.org